Vol.4 No.3 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

اردو ناول کے اسلوب کی تشکیل میں مابعد جدیدیت کے عوامل کا کردار

The role of postmodern factors in the formation of Urdu novel's style

ا۔رحمان سرور باجوہ

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

۲۔ڈاکٹر طاہر عباس

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

۳۔ڈاکٹر واصف اقبال صدیقی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

Abstraaact:

The postmodernism is a historical period in which a modern person has to survive. This era owns command of media which makes changes in every walk of life. In this respect the whole life of man is changed. Every writer is inspired by his environment, so the language and literature is also inspired to these changes. This article seeks to investigate and evaluate the factors of postmodernism and also depicts light on the significance of these factors in constituting postmodern Urdu novel text. This article asserts that literary movements, science and destruction of war, acquaintance and media, insignificance of religion, multinational or consumer capitalism, exploitation system take part in mking of style of postmodern Urdu novel.

Keywords: Factors of Postmodernism, Media, Languge and Litrature , Research , Urdu Novel, Overview.

مابعد جدیدیت ایک تاریخی دور ہے جس میں جدید انسان کو زندہ رہنا ہے۔یہ دور میڈیا کی کمان کا مالک ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں لاتا ہے۔اس لحاظ سے انسان کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ہر ادیب اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے لہٰذا زبان و ادب بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوتا ہے۔یہ مضمون مابعد جدیدیت کے عوامل کی تحقیق اور جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہے اور مابعد جدید اردو ناول کے متن کی تشکیل میں ان عوامل کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔یہ مضمون اس بات پر زور دیتا ہے کہ ادبی تحریکیں، سائنس اور جنگ کی تباہی، واقفیت اور میڈیا، مذہب کی بے وقعتی، کثیر القومی یا صارفی سرمایہ داری، استحصالی نظام مابعد جدید اردو ناول کی طرز کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔

کلیدی الفاظ: مابعد جدیدیت کے عوامل، میڈیا، زبان و ادب، تحقیق، ادبی تحریکیں، اردو ناول، اجمالی جائزہ

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کوئی بھی عمل اگر یکسانیت اور تکرار کا شکار ہو جائے تو وہ جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ادب کے ساتھ بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔ادبی تحریکیں ادب کے جمود کو توڑتی ہیں اور نئے امکانات کو متعارف کراتی ہیں۔ یہ مخصوص وقت اور تقاضوں کے تحت اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔پرانی تحریکوں کی جگہ نئی تحریکیں لے لیتی ہیں۔ تحریکیں نئے طرز زندگی اور نئے تصورات کے لیے راہ ہموار کرتی ہیں۔اردو ادب میں ویسے تو بہت سی تحریکوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے لیکن ان میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت نے اردو زبان وادب کو بہت متاثر کیا ہے۔ تحریکوں سے ادب کو فوائد بھی پہنچتے ہیں لیکن مخصوص تناظر کی وجہ سے ادب محدود بھی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے اپنی بنیاد مارکس (کارل مارکس انیسویں صدی کا ایک جرمن مفکر اور ماہر اقتصادیات تھا) کے اشتراکی اصول و نظریات پر رکھی۔مارکس سماج اور تہذیب کی تشکیل میں مادی حالات کو اہمیت دیتا ہے۔مادی حالات میں آرٹ کے سبھی مظاہر بھی آجاتے ہیں جس میں ادب بھی شامل ہے لہذا ادب کی تخلیق بھی مادی اثرات کے تحت ہونی چاہیے۔ غرض اس تحریک کے نتیجے میں ادب کو سیاسی، سماجی اور معاشی و اقتصادی حالات کے تحت دیکھنے کی کوشش کی گئی۔اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی ضد میں جدیدیت نے تخلیقی آزادی کا نعرہ دیا اردو فکشن نگاروں نے ساٹھ کی دہائی سے علامت نگاری اور تجریدیت کے تجربات کیے۔ان مصنفین نے تقلید کے جوش میں ادب کے بنیادی تقاضوں کو نظر انداز کر دیا۔ادبی فضا میں یکسانیت اور تکرار نے جب حد سے تجاوز کیا تو اردو ناقدین نے بدلتے منظر نامے کے مطابق ادب تخلیق کرنے پر زور دیا کہ ادب میں سماجی، ثقافتی اور معاشی صورتحال میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے مطابق مسائل کو پیش کیا جائے۔اس بدلتی صورت حال کو مابعد جدیدیت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مغرب میں تو مابعد جدیدیت کی فکر کا آغاز دو بڑی جنگوں کی تباہ کاریوں کے بعد ہوا لیکن اردو ادب میں اس فکر کے اثرات ۱۹۸۰ء کی دہائی سے دکھائی دینے لگے۔مابعد جدیدیت مرکزیت کی بجائے لامرکزیت، باطن سے خارج کی جانب سفر، رومانیت کی بجائے حقیقیت پسندی، آفاقیت کی بجائے مقامیت کا رجحان رکھتی ہے۔مابعد جدیدیت میں ہر قسم کے نظریے کو پیش کرنے کی اجازت ہے تاہم معنی کی تشکیل سماجی، ثقافتی اور تاریخی تناظر میں کی جاتی ہے۔ جدید ذہن رکھنے والے لوگوں میں ایک اہم نام گوپی چند نارنگ کا بھی ہے تاہم ان کو جلد ہی اس بات کا احساس ہوا کہ جدیدیت کی متواتر روایت سے اردو فکشن کو نقصان پہنچ رہا ہے اور وہ اس نئی صورت حال کو بھانپ کر ناقدین کی توجہ اس کی جانب موڑتے ہیں:

> ”مابعد جدیدیت ایک تاریخی دور بھی ہے جس میں دنیا داخل ہو چکی ہے۔ اردو زبان خواہ کسی ملک میں ہو اس سے باہر نہیں۔ برقیاتی میڈیا کی یلغار سے پوری دنیا زیر و زبر ہو رہی ہے۔ نئی تکنیکی ایجادات، مصنوعی سیاروں، ترسیل و تبلیغ کی بڑھتی ہوئی سہولتوں، کمپیوٹر ٹیکنالوجی، کمرشل تقاضوں، صارفیت کی ریل پیل اور منڈی معشیت نے جہاں بظاہر نئی ترقیوں کے دروازے کھول دیئے ہیں وہاں مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ جن کا کوئی آسان حل سامنے نہیں۔ فیصلوں کی طاقت اب سیاسی قدر سے زیادہ کمرشل قدر کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ یہ معمولی تبدیلی نہیں، جس انفارمیشن ہائی وے کا چرچا ہے ہم اس کی زد میں ہیں۔ خرید و فروخت، حصول علم، تجارت، ترس سب پر اس کا اثر پڑ رہا ہے۔ جب پوری زندگی، سماج کا ڈھانچہ انسان کے رویے اور ثقافتی ترجیحات ہر چیز بدل رہی ہے تو کیا زبان وادب اس فضا سے الگ ہیں۔“(۱)

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

عہد حاضر مابعد جدیدیت کا عہد ہے۔مابعد جدیدیت کی فکر پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ بات عیاں ہے کہ اس کی فکر تکثریت کی حامل ہے جس کی وجہ سے اس کی کوئی حتمی اور قطعی تعریف ممکن نہیں۔ایک تخلیق کار اپنے ماحول سے اپنی تخلیق کا مواد حاصل کرتا ہے اور ماحول کوئی مجرد شے نہیں۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مختلف رجحانات اور محرکات کے اثرات قبول کرتا ہے۔یہ رجحانات اور محرکات نہ صرف ایک عہد کو تشکیل دیتے ہیں بلکہ یہی رجحانات اور محرکات ایک تخلیق کار کے جذبات اور احساسات کی بھی تعمیر کرتے ہیں۔چنانچہ جب ایک تخلیق کار اپنی تخلیق میں اپنے رویے اور احساس کی ترجمانی کرتا ہے تو دراصل اپنے عہد کی ترجمانی کر رہا ہوتا ہے۔مابعد جدیدیت کی فکر کو ادب کی تمام اصناف میں مکمل طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا لیکن اس فکر کا اسلوب ایک تخلیق کار کی تحریر میں ضرور اجاگر ہوتا ہے۔اس آرٹیکل میں ان عوامل کو زیر غور لایا جائے گا جو مابعد جدید عہد کی تشکیل کرتے ہیں اور پھر ایک ناول نگار کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ نئی صورتحال کے مطابق چیزوں کی تخلیق کرے۔

ا۔سائنس اور جنگ کی تباہ کاریاں:

مابعد جدیدیت کی صورتحال کی تشکیل میں سب سے اہم کردار سائنس کی ترقی اور مشینی تہذیب کا ہے۔بیسویں صدی میں سائنس نے ترقی کی تو اس سے مشینی تہذیب ظہور پزیر ہوئی۔ مشینی تہذیب میں رہتے ہوئے انسان نے کئی قسم کی کی جدید سہولتوں سے استفادہ کیا لیکن مشینی تہذیب نے انسان کی ذات میں مختلف انواع کی سماجی اور اخلاقی قباحتوں کو بھی جنم دیا۔اس تہذیب نے سماج میں طاقتور انسان کو سکھایا کہ کمزور اور لاچار انسان کے لیے کیسے تحفظ اور بقا کا مسئلہ پیدا کر سکتا ہے۔اس مشینی دور سے قبل انسان اخلاقی اعتبار سے مضبوط تھا اور دوسرے انسانوں کے لیے اعتماد اور اعتبار کی فضا تشکیل دینے میں معاون کردار ادا کرتا تھا۔ مشینی تہذیب کی چیرہ دستی نے انسان کو اس کے بنیادی فریضہ سے بے دخل کر دیا۔یوں انسانی ذات پیچھے رہ گئی اور مشینیں انسانی حواس پر چھا گئیں۔اس مشینی تہذیب کی وجہ سے خود انسان کو ایک طرف اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں سے ہاتھ دھونا پڑا دوسری طرف مشینوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی وجہ سے اس کی اپنی ذات مشینوں کی مانند احساس اور جذبے سے عاری ہو کر رہ گئی۔ مشینی تہذیب میں رہتے ہوئے انسان محض اپنی ذات کا ہی اسیر ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ سماج میں طاقت ور ہونے کے بعد اسے اپنے سرمائے کی بدولت معاشرے میں کمزور اکائیوں کا استحصال کرنے کا موقع بھی میسر آگیا اور سرمایہ درانہ نظام نے اپنی جڑیں مضبوط کیں۔ سرمایہ دارانہ نظام سے مزید خرابی یہ پیدا ہوئی کہ سرمایہ دار گروپ سیاسی نمائندوں کے ذریعے ملکی اور خارجی پالیسیاں بنانے میں اثرانداز ہونے لگے۔ نیز پیداواری اشیا مارکیٹ میں لانے کے لیے منصوبہ بندی کرنے لگے۔ ان پیداواری اشیا میں انسان کی تباہی کے لیے بھی سامان تھا۔ سرمایہ دار اپنے جنگی سامان اور اسلحہ بیچنے کے لیے ملکوں کو جنگی قرضہ دینے لگے۔روف نیازی اس مظہر پر کچھ یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ”جدیدیت نے مٹی کے تقدس اور تشخص کو ختم کر کے اسے ایک میکانکی تصور میں ڈھال دیا۔بے جان مادے کو کائنات کا مرکز بنایا،اپنی تمام تر تحقیق و تفتیش اور سائنسی مباحث کا مرکز اسی مادے کو قرار دیا۔مادے کے فیوض و برکات سے بہرہ ور تو

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہوئے لیکن حرمت ارض سے انکار کر کے ماحولیاتی استحصال اور تخریب کاری کا راستہ بھی کھول دیا۔اپنی مٹی سے جڑے افراد واقوام کو دیدہ دانستہ اپنے ارضی حوالوں سے کاٹ کر ان پر بے زمینی کے استحصال کو روا رکھا۔"(۲)

جدیدیت کے پیش نظر انسان تھا۔ لیکن مشینی زندگی کے آغاز اور اور سرمائے کی دوڑ نے دنیا کو دو عالمی جنگوں میں دھکیل دیا۔ان دو عالمی جنگوں میں سب سے زیادہ نقصان انسان کو پہنچا۔ناامیدی،مایوسی، محرومی،خوف وہراس اور دہشت کی فضا کی وجہ سے انسان کا انسان پر یقین اور اعتبار جاتا رہا۔جنگ کی تباہ کاریوں کے اثرات ختم کرنے میں نہ تو سائنس نے کردار ادا کیا اور نہ ہی مذہبی اقدار نے کچھ دفاع کیا۔اس صورتحال نے اس نئی فکر اور زندگی کے جدید نظریہ کے احیاء کی جانب توجہ کی اور مابعد جدیدیت کی فضا کو ہموار کیا۔

۲۔ علمیت اور میڈیا:

میڈیا موجودہ دور کی ایک مرکزی قوت ہے اور تعلیم اور تفریح سے متعلقہ مقاصد کے حصول کا اہم ذریعہ ہے۔ میڈیا نے زمانی اور مکانی فاصلوں کو ختم کر دیا اور معلومات کی ترسیل میں جدت اپنائی۔اس جدت کے اثرات کا اندازہ ہم زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً تعلیم، تفریح، تجارت،ادب اور لوگوں کے مابین رابطوں سے لگا سکتے ہیں۔ شروع شروع میں معلومات کو دنیا کے دوسرے کونے میں پہنچنے میں شعوری اور غیر شعوری طور پر طویل عرصہ درکار تھا لیکن اب کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی بدولت ہر قسم کی معلومات کو کسی بھی لمحے دنیا کے کسی مقام پر دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔ مشینی دور نے انسان کی ترجیحات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔آج کا انسان رفتہ رفتہ کتاب سے دور ہوتا جا رہا۔اپنے آپ کو علم کی دولت سے آشنا کرنے کے لیے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔اس لیے آج کے دور میں وہی ادب، زبان، علم اور معلومات توجہ کا مرکز ہے جو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی حدود میں داخل ہے۔ جو زبان، علم اور معلومات کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تک دسترس نہیں رکھتے وہ زبان، علم اور معلومات بھی لوگوں کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں۔ رؤف نیازی رقم طراز ہیں:

> "مابعد جدید سماج میں شعور وآگہی منظم اداروں کی تحویل میں آچکی ہے اب علم کا پیمانہ یہ ہے کہ اس معاشرے میں اگر کوئی چیز ترجمہ نہ کی جا سکتی ہو، ہندسوں میں تبدیل نہ کی جا سکتی ہو اور کمپیوٹر میں ذخیرہ نہ کی جا سکتی ہو تو وہ علم کے زمرے سے خارج متصور ہو گی۔اب علم کا متضاد جہل نہیں ہے، شور ہے۔ جو چیز علمیت کی تعریف میں نہ آسکے اسے noise کہہ کر ناقابل شناخت قرار دے دیا جاتا ہے۔"(۳)

دوسری جنگ عظیم کے بعد تبدیلیاں تیزی سے رونما ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں سائنس اور صنعتی معاشرے کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ ٹیکنالوجی کی مدد سے لوگوں کے ایک دوسرے کے ساتھ رابطوں میں تیزی اور آسانی پیدا ہوئی۔ دنیا عالمی بستی بن جانے کی وجہ سے دور دراز کے معاشرے بھی عالمی تناظر میں ہونے والی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

میڈیا فعال ہونے سے جمالیاتی اقدار اور تخلیقی عمل کو پس پشت ڈالا گیا ہے اور میڈیا کی مدد سے تشکیلی حقیقت پر زور دیا گیا ہے۔ تشکیلی حقیقت میں پوشیدہ باتیں منظرِ عام پر نہیں لائی جاتیں اور ایسی حقیقت کا عکس پیش کیا جاتا ہے جو سوچا سمجھا اور من چاہا ہے۔ اس طرح عدم موجودگی کے عنصر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ آج کا مابعد جدید انسان تشکیلی حقیقت میں جینے پر مجبور ہے۔ مابعد جدیدیت تشکیلی حقیقت کو اپنی فکر میں اس لیے جگہ دیتی ہے کیونکہ اس میں تکثریت کا پہلو غالب ہے اور مابعد جدیدیت چیزوں کو غیر متعین رکھنے کی غرض سے تکثریت کا سہارا لیتی ہے۔

اطلاعتی ٹیکنالوجی کی بدولت علم کی حیثیت محض رسمی ہو کر رہ گئی۔ علم شخصیت کو استحکام دینے کی بجائے مادیت پرستی کو پروان چڑھانے لگا۔ اس بات کی تائید میں گوپی چند نارنگ بھی کہتے ہیں:

> ''علم جو پہلے ذہن انسانی کو جلا دینے اور شخصیت کو سنوارنے، نکھارنے کے لیے حاصل کیا جاتا تھا وہ اب فقط اس لیے پیدا کیا جائے گا کہ منڈی کی معشیت میں اس سے منافع اندوزی کی جا سکے۔''(۴)

۳۔ ثقافتی اقدار کی کمزوری اور سماجی ناہمواری:

آج دور جدید کے تقاضوں کے تحت لوگوں کی سوچ و فکر میں تغیر پذیری جاری و ساری ہے۔ چونکہ زندگی کی تمام سہولتیں بڑے شہروں میں میسر ہوتی ہیں اس لیے لوگ اپنے معیار زندگی کو بلند کرنے کی فکر میں اور نت نئی سہولتوں کے حصول کی خاطر بڑے شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ جب لوگ دور دراز اور پسماندہ علاقوں سے شہروں کا رخ کرتے ہیں تو اپنی ثقافت، تہذیب اور تمدن کو بھی ان بڑے شہروں میں داخل کرتے ہیں۔ اس عمل سے شہروں میں ثقافتی مرکزیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ شہری بالائی سطح پر بین الاقوامی سوچ کے حامل ہوتے ہیں اور زیریں سطح پر نسلی، وطنی اور لسانی گروہ قائم کر لیتے ہیں۔ اس طرح بڑے شہروں کی زندگیوں میں ایک دوہرا پن اور دوغلا پن داخل ہو جاتا ہے۔ دو عظیم جنگوں اور پھر ہندوستان کی تقسیم کے بعد لاکھوں لوگوں نے ایک مقام سے دوسرے مقام تک ہجرت کی اس ہجرت کی بدولت بھی حاشیے پر موجود قوموں کو مرکز میں شامل ہونے کا موقع ملا۔ جیسا کہ مستنصر حسین تاڑر اس مظہر کو اپنے ناول کا موضوع بنا کے بات کرتے ہیں:

> ''لیکن جب زمینوں کے بیٹے دربدر ہو کر نا آشنا زمینوں کی جانب قافلے ہوئے تو ان زمینوں کو کیا پتہ کہ یہ جو آئے ہیں تو کون آئے ہیں۔ رذیل ہیں یا اعلیٰ ذات کے ہیں۔ گل بوٹے اور شجر بھی گواہی دینے سے قاصر ہیں کہ وہ نا آشنا ہوتے ہیں۔ یوں سانسیوں، گگڑوں اور تپڑواسیوں نے بھی اپنی آبائی بستیاں ترک کر دیں ہیں اور کہیں جا کر آباد ہوئے۔ اور ان میں سے کوئی ملک ہو گیا، کوئی چوہدری۔۔۔۔۔ کوئی مرزا اور جو جرات والے تھے وہ ایک ہی جست میں سید ہو گئے۔''(۵)

اس اقتباس کو پڑھتے ہوئے مصنف کی اگرچہ بے چینی عیاں ہے کہ حاشیے پر رہنے والے لوگوں کا مرکز میں شامل ہونے سے ان کی اصل شناخت نہیں ہو پاتی لیکن یہ صورت حال مابعد جدیدیت کی فکر کی ترجمانی کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت غیر متعین صورتحال کو ہی اہمیت دیتی ہے اور کوئی حتمی حیثیت تسلیم نہیں کرتی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب معاشرے میں سماجی و اقتصادی حوالے سے ناہمواری پیدا ہوئی تو اس عصری تبدیلی نے اپنے

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

دور رس اثرات مرتب کیے اور ایک ایسی صورتحال کو جنم دیا جو ثقافت اور سماج کے مہابیانیوں کو رد کرتی ہے اور تکثریت کا پرچار کرتی ہے۔اس تبدیلی نے انسانوں کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ کیا اور ہر عمل اور چیز کو دہرے پن سے دیکھنے کا شعور دیا۔

۴۔مذہبی گرفت کی کمزوری:

مذہبی گرفت کی کمزوری سے مراد مذہب کو انسانی زندگی میں وہ اہمیت حاصل نہیں جو کبھی پہلے کسی دور میں حاصل تھی۔مذہبی گرفت کی کمزوری آج کے جدید دور کے ہر معاشرے میں دیکھی جاسکتی ہے۔آج کے ترقی یافتہ دور میں مذہب محض دکھاوے کی چیز بن کے رہ گیا ہے۔مذہبی پیشوا چاہے جس بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں وہ عوام کا استحصال کرتے ہیں۔وہ خود سچائی اور صداقت کے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں اور عوام کو بھی صحیح راستے پر چلنے سے گمراہ کرتے ہیں۔اس صورتحال کی وجہ سے عوام اپنی عبادت گاہوں سے متنفر ہو گئے ہیں۔ان کا مذہب سے اعتماد اٹھتا جارہا ہے۔مذہبی گرفت کی کمزوری کے عمل کی وجہ سے خدا کی ذات بھی آج کے جدید انسان میں مشکوک ہوتی جارہی ہے۔مذہبی گرفت کی کمزوری ہی کی وجہ سے معاشرہ اخلاقی انحطاط کا بھی شکار ہوا۔خدا کی ہستی اخلاقیات کا سب سے بڑا سرچشمہ تھی لیکن جب لوگ خدا کے وجود سے انکار کرنے لگے تو اخلاقی اصول بھی کمزور پڑنے لگے۔اس وجہ سے پھر معاشرے میں آزاد خیالی اور روشن خیالی نے نشو نما پانا شروع کی۔ناول فرات میں وقار احمد کی نسل اپنی تہذیبی روایت سے کٹ کر تمام اخلاقی ضابطوں کو مسترد کر دینا چاہتی ہے اور ان رسوم سے آزاد ہونا چاہتی ہے جو آزادانہ زندگی میں رکاوٹ ہیں:

> ”ریلٹی کیا ہے؟ریلٹی یہ ہے کہ میں ہوں اور سکوٹر چلا رہا ہوں،اس کے علاوہ جو گزر گیا نہ تو وہ ریلٹی ہے نہ ہی جو آنے والا ہے۔وہ!جب سب کچھ فوگی ہے تو پھر دیکھنے کی کوشش بے کار۔سب سالا فراڈ ہے۔۔۔کھلا فراڈ۔۔۔۔جو دکھائی نہیں دیتا وہ الیوژن ہے اور بس!۔۔۔۔۔مگر وہ۔۔۔۔۔خدا۔۔۔۔۔وہ بھی نظر نہیں آتا۔۔۔۔اگر ہے تو مجھے کیا؟اس کے ہونے سے مجھ پر کیا اثر پڑتا ہے اور نہ ہونے سے میرا کیا بگڑ رہا ہے۔“(۶)

مذہب سے بیزاری اور مغربی نظریات اور تصورات کی وجہ سے پیدا ہونے والے اخلاقی انحطاط سے لوگوں میں بے چینی اور انتشار نے اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔اس نازک صورتحال میں مذہبی پیشوا جو کہ خود تضادات کے شکار تھے اور اپنا اصل کردار ادا کرنے سے قاصر رہے۔اس وجہ سے معاشروں میں زبردست تغیر رونما ہوا اور معاشروں میں انارکی اور انتشار نے جگہ لے لی۔رؤف نیازی اسی تناظر میں کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

> ”مذہب،فلسفہ اور ادب فرد اور سماج کے درمیان ایک توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔جب اور جہاں یہ توازن بگڑتا دکھائی دیتا ہے تو فکر و دانش نئی راہیں ڈھونڈتی ہے۔۔۔۔مابعد جدیدیت نے افکار کو بے دخل کر کے انسان کو بے مرکز کر دیا ہے۔“(۷)

۵۔صارفی سماج:

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

صارفیت کی ثقافت صنعتی عہد پر انحصار کرتی ہے اور صنعتی عہد سرمایہ داری سے وابستہ ہے۔ صنعتی عہد میں پیدا ہونے والی اشیا لوگوں کے استعمال میں آتی ہیں۔ صارفیت کی ثقافت نے ہر چیز کو بکاؤ مال میں بدل دیا ہے۔ اس عمل نے نہ صرف انسانیت کی عزت و توقیر کو مجروح کیا ہے بلکہ اخلاقی اقدار کو بھی تہس نہس کر دیا ہے۔ جیسا کہ حسین الحق لکھتے ہیں:

> ''مولوی مذہب کو بیچ رہے ہیں، عالم اپنا علم بیچ رہے ہیں، دانشور دانش بیچ رہے ہیں۔ اور سند یافتہ سند بیچ رہے ہیں حیات اللہ انصاری نے تو ماں کو بھی بکاؤ مال بنا دیا ہے۔''(۸)

صارفیت میں افراد کی بجائے اشیا اہمیت اختیار کر جاتی ہیں۔ اشیا کی کھپت اور اشیا کی طلب نے ساری دنیا کو ایک شاپنگ مارکیٹ بنا دیا ہے۔ ناول غلام باغ میں صارفیت کے کلچر کے اثرات اس طور مختلف ہیں کہ معاشرے کا ہنر مند طبقہ اپنی ضروریات کے حصول کی خاطر ذلت آمیز راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ علم جو انسان کو صحیح اور غلط میں تمیز کرنا سکھاتا ہے اور علم جو انسان کی شخصیت کو نکھارتا ہے۔ وہی علم مادی ضروریات کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ قلم کی حرمت بکاؤ مال کی صورت اختیار کر جاتی ہے:

> ''۔۔۔۔۔۔ میں ایک کرائے کا ادیب ہوں سر! بلکہ ادیب شاید زیادہ باعزت لفظ ہے۔ میں ایک کرائے کا لکھنے والا جیسے کرائے کے قاتل ہوتے ہیں۔ ناں جی I am a mercenery writer دنیا کے کسی بھی موضوع پر پائے جانے والے کسی بھی قسم کے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لیے پورے مدلل طریقے اور مکمل روانی طبع سے لکھ سکتا ہوں۔ کوئی بھی آجائے معاملہ طے کرے اور کچھ بھی لکھوا لے۔''(۹)

صارفیت سے متعلقہ اشیا ہماری ثقافت کے ساتھ اس قدر جڑتی جا رہی ہیں کہ ان کے بغیر زندگی کا تصور اب دشوار دکھائی دیتا ہے۔ ثقافتی تبدیلی معاشی تبدیلی رکھتی ہے۔ جب اشیا کسی سماج میں داخل ہوتی ہیں تو ان کی طلب و رسد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح سرمائے کو اپنے قدم جمانے کا موقع میسر آتا ہے۔ جب سرمایہ اپنے قدم جما لیتا ہے تو سیاست اور ادب پر اس کے اثرات پڑتے ہیں۔ اقبال مجید نے اپنے ناول ''نمک'' میں اس صارفی سماج کی مختلف صورتوں کو پیش کیا ہے۔

> ''اب میرے گھر میں جھانک لیں۔ اس کمرے میں میں رہتی ہوں اور میرا ایک ساتھی جو اپنی معلومات اور یادداشت سے مجھے ہمیشہ حیران کیئے رہتا ہے۔ اس کو میں زیادہ تر اپنے زانوں پر بٹھاتی ہوں۔ اس کا نام لیپ ٹاپ ہے۔ یہ مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے دیا ہے۔''(۱۰)
>
> ''تمھارے فون میں وہ رکارڈ نصب ہے نا جو تمھاری غیر موجودگی میں پیغامات رکارڈ کرتا ہے۔''
>
> ''ہاں ہے۔''
>
> ''تم کمپنی سے کہہ نہیں سکتی کہ تم گھر پر تھیں ہی نہیں، اس لیے پیغام نہیں ملا۔''
>
> ''ظاہر ہے، کار میں بھی فون ہو گیا ہے، راستے میں بھی احکامات مل سکتے ہیں۔ تو۔۔۔۔۔''

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

"تو یہ کہ ہر سمت ہر جگہ اور ہر پل تم تاجروں کی مضبوط گرفت میں ہو۔"(۱۱)

گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ صارفی سماج سرمایہ دارانہ نظام کو مضبوط کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام محض اپنی توجہ اشیا کی پیداوار اور صارفیت پر مرکوز نہیں کرتا بلکہ سرمائے کو بڑھانے اور اس نظام کو مضبوط کرنے کے لیے بنیادی انسانی حقوق کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔ صارفی سماج کے یہ دور رس اثرات انسان ہی کا استحصال کرتے ہیں۔

۶۔ استحصالی نظام:

سرمایہ داری اور استعماریت لازم و ملزوم دیکھائی دیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سرمائے کے انحطاط کی وجہ سے جب بیسویں صدی کے آخر میں صارفیت کے کلچر کو پروان چڑھایا گیا تو خام مال اور سستی لیبر کو مرکز بنا کر استحصالی نظام کی جڑیں مضبوط کی گئیں۔ ناول "فائر ایریا" ان مزدوروں کے مسائل کی بات کرتا ہے جو اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر کوئلے کی کانوں میں رزق تلاش کرتے ہیں اور اپنی ساری زندگی اپنے گھر بار سے دور رہ کر کولیری کی اندھیر نگری میں گزار دیتے ہیں۔ یہ مزدور ناانصافی اور ظلم برداشت کرتے ہیں اور یہ ظلم اور زیادتی کوئی غیر ملک نہیں بلکہ اپنے ملک کے باشندے ہی کرتے ہیں جن کی حیثیت ایک نو آبادکار کی ہوتی ہے۔

ایک دن محمد ارنے اس سے پوچھا

"ایک گاڑی کوئلہ کا وزن کتنا ہوتا ہے، معلوم ہے؟"

"ایک ٹن"

"جانتے ہو ایک ٹن کتنے cft کا ہوتا ہے؟"

"نہیں۔"

"ایک ٹن ہوتا ہے ۶۳ سی ایف ٹی اور کول ٹب جو بنائے جاتے ہیں جسے تم لوگ گاڑی کہتے ہو وہ ۴۰ cft کا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر کول ٹب میں ۴ سی ایف ٹی کوئلہ ایسا کٹتا ہے جس کی اجرت لیبر کو نہیں ملتی اور مالک کو جس پر کوئی لاگت نہیں آتی۔"(۱۲)

استحصالی طاقتوں نے براعظم ایشیا، افریقہ اور امریکہ کو اپنے نشانے پر رکھا اور ان براعظموں کے ممالک میں لوگوں کا استحصال کیا۔ امریکہ کے علاوہ ایشیا اور افریقہ میں آج بھی ممالک اس استحصالی نظام کی گرفت میں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر بظاہر استحصالی طاقتیں پردہ غائب میں چلی گئیں لیکن ان کا اثر ابھی تک باقی ہے کہ استحصالی نظام کے شکار ممالک کے لوگ ابھی بھی سماجی، سیاسی، ثقافتی، اور اقتصادی طور پر سابقہ نظاموں سے وابستہ ہیں۔ استحصالی نظام کا کلچر اس نظام کے شکار ممالک کے لوگوں کی فطرت میں شامل ہو چکا ہے۔ کہیں تو اس استحصالی معاشرے کا فرد طاقت کو سماج میں سارا کھیل سمجھتا ہے اور اس طاقت کے ساتھ وابستہ ہو کر زندہ رہنا چاہتا ہے اور کہیں طاقت پر انحصار کر کے معاشرے میں دوسرے افراد کا استحصال کرتا دیکھائی دیتا ہے۔ برصغیر میں رہنے والے عوام ایک غلط فہمی کا شکار ہیں اور عالمی تہذیب اور جنوبی ایشیا کی تہذیب میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔ اس لیے وہ

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

یورپ کی سامراجی اور استحصالی حیثیت کو گہرائی سے نہیں دیکھتے اور اپنے لیے خود انحصاری، آزادی اور خود شناسی کے روشنی کے دیے کو بجھا دیتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے ناول ''خس و خاشاک زمانے'' میں سامراجی اور استحصالی طبقے کے جبر اور استحصال کی تصویریں پیش کی ہیں:

> ''مذہب اور پورپور تک بے ایمان اور کرپٹ سیاست دان، فوج، عدلیہ اور مذہب کی گھناونی تنگ نظری اور بے حسی۔۔۔۔ یہ ایسے ٹڈی دل تھے جو اس ملک کی ہریاول کو چاٹ گئے۔۔۔ اور قوم۔۔۔۔۔ اگر اسے قوم کہا جا سکتا ہے تو اس کے بیشتر افراد جونکوں میں بدل گئے۔۔۔۔ جونکیں تو جب خون چوس چوس کر پھول کر کپا ہو جاتی ہیں تو اپنی ہی زمیں پہ گرتی ہیں پر وہ دوبئی، امریکہ اور یورپ میں جا گرتے ہیں۔''(۱۳)

اردو ادب میں بیشتر ناول نگاروں نے اس استحصالی نظام کو پیش کیا ہے۔ نو آبادیاتی ممالک کے باشندے ایک متبادل نظام زندگی گزارنے کی بجائے ہر لحہ استحصالی قوتوں کے دست نگر بن کر رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کی عادات و اطوار، ان کی طبیعت کا رنگ اور مزاج کا ڈھنگ ایک مخصوص نظام سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ نو آبادیاتی نظام میں پروان چڑھنے والی کھیتی میں مقامیت کی بجائے غیر ممالک کی اشیا کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور اس دکھ کو مرزا اطہر بیگ اپنے ناول غلام باغ میں کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:

> ''تم یہاں کے روسا، یہاں کے نو دولتیوں، یہاں کے بڑے بڑے جاگیرداروں حتی کہ یہاں کی تہذیب و ثقافت کے نام نہاد علمبرداروں کی کوٹھیاں دیکھ لو۔ ان کے عالی شان بنگلے دیکھ لو۔ تمھیں وہاں ایک بھی مقامی درخت نہیں ملے گا۔ ان میں کوئی بھی کیکر، نیم، شریں، شیشم کو اپنے لانوں میں اگانا پسند نہیں کرتا۔ یہ کچھ مقامی درختوں کے نام ہیں۔ یہ سب تمھیں ملیں گے بس سڑکوں کے کنارے۔ اِدھر اُدھر اکا دکا بس اپنے زور پر اُگے ہوں گے۔ تم گوروں نے ہم سے ہماری نباتات بھی چھین لی ہیں۔''(۱۴)

ادب سماجی مسائل کو اجاگر کرنے میں دوہری حیثیت رکھتا ہے۔ روش ندیم کہتے ہیں:

> ''ادب و فن جہاں انسان کے تہذیبی و ثقافتی اظہارات کی سب سے اعلی جمالیاتی و فکری صورت ہے۔ وہاں یہ ایک تاریخی ریکارڈ کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ فطرت اور سماج کے جبر اور ان کے سامنے انسان کی بے بسی کی تصویریں بھی پیش کرتا ہے۔ اگر تاریخ بڑے دھارے میں ایک بڑے اجتماع کے دور بینی مطالعے کا نام ہے تو ادب و فن فرد کی سطح پر خوردبینی مشاہدہ ہے۔ یا یوں کہیے کہ تاریخ کسی اونچے مینار سے شہر کو دیکھتی ہے اور ادب کسی گلی میں کھڑے ہو کر قریب ترین احساساتی مطالعہ ہے۔''(۱۵)

برطانوی نو آبادیات کے مہابیانیے کے استرداد کے بعد عالمی سماج کو عام طور پر اور مابعد نو آبادیاتی سماجی اکائیوں کو بالخصوص نئے سماجی اور معاشی بیانیوں کا چیلنج درپیش ہوا جس نے مقامی شناختوں کو بری طرح مسخ کر دیا۔ ادب ذاتی اظہار کی سب سے اہم صورت ہے۔ جس کے ذریعے محکوم قومیں خود پر کیے گئے ظلم و ستم کو بیان کرتی ہیں۔ ناول ''نادید'' میں مصنف اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

"یہاں شکر کا ایک کارخانہ ہے رونی! اس کے مالک بیچنے کے لیے تو ہر روز سینکڑوں ہزاروں من شکر بناتے ہیں مگر اپنے مزدوروں کے جیون میں زہر گھولتے ہیں۔"(۱۶)

"..... ہمارے باپ دادا نے کیا اسی لیے باہر والوں سے دیش آزاد کرایا تھا کہ اندر والے غلاموں کی منڈیاں کھولتے چلے جائیں۔۔۔۔ یا کہیں ایسے تو نہیں ہو رہا کہ باہر والے اب ہماری ماؤں کی کوکھوں میں ہی ان کے بچے تلف کر دیتے ہیں اور ان کی جگہ آپ پیدا ہو جاتے ہیں۔"(۱۷)

مابعد جدیدیت فطری کائنات کا میکانکی روپ نہیں دیکھ سکتی۔ بلکہ مابعد جدیدیت یقین رکھتی ہے کہ دنیا کو کسی مشین سے مماثلت نہ دی جائے بلکہ یہ دنیا ایک زندہ حیاتیاتی عضو کی طرح ہے جو سانس لیتا ہے۔ مختصر یہ کہ جس طرح کسی شخص کے لسانی مزاج کی تشکیل میں اس کا معاشرہ، تہذیب، ماحول، علمی و ادبی روایات اہم کردار ادا کرتے ہیں اسی طرح مندرجہ بالا عوامل ایک نئی تحریک نہ سہی مابعد جدیدیت کے رجحان کی تشکیل میں اپنا بنیادی کردار ضرور ادا کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ گوپی چند نارنگ، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ (دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۱۱ء)، ص ۴۵۔

۲۔ رؤف نیازی، مابعد جدیدیت۔ تاریخ و تنقید (کراچی: حلقہ آہنگِ نو، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۴۰۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۴۔ گوپی چند نارنگ، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، ص ۲۴۔

۵۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خشاک زمانے (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۴۸۔

۶۔ حسین الحق، فرات (دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۲۳۔

۷۔ رؤف نیازی، مابعد جدیدیت۔ تاریخ و تنقید، ص ۲۹۔

۸۔ حسین الحق، فرات، ص ۱۳۵۔

۹۔ مرزا اطہر بیگ، غلام باغ (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۹۶۔

۱۰۔ اقبال مجید، نمک (الہ آباد: سرسوتی پریس، ۱۹۹۱ء)، ص ۲۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۲۔

۱۲۔ الیاس احمد گدی، فائر ایریا (دہلی: عزیز پرنٹنگ پریس۔ ۱۹۹۲ء)، ص ۷۸۔

۱۳۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خشاک زمانے، ص ۴۲۳۔

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

۱۴۔ مرزااطہر بیگ، غلام باغ، ص ۴۳۔

۱۵۔ روش ندیم، ڈاکٹر، "مقدمہ"، مشمولہ: اردو غزل۔ ما بعد نو آبادیاتی مطالعہ، محمد روف (فیصل آباد: روہی بکس، ۲۰۱۵ء)، ص ۲۴۔

۱۶۔ جوگندر پال، نادید (دہلی: گرے ٹری کیلاش، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۶۴۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۶۶۔